ن م راشد کا متروک کلام

ڈاکٹر سلیم اختر

As a student at Government College (now GC University) Rashed was also editor of the literary magazine 'Ravi'. He had published his own poems in 'Ravi' under different names. These poems, not included by the poet in any of his collections, have been reproduced in this article by Dr. Saleem Akhtar.

گورنمنٹ کالج لاہور کو محض درس وتدریس کا ایک ادارہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کئی امور کی بنا پر عام کالجوں سے ممتاز سمجھا جا سکتا ہے۔ ابتدا سے ہی برصغیر کی اس قدیم ترین درس گاہ (قیام: جنوری ۱۸۶۴ء) سے متعلق اساتذہ میں نامور اہلِ علم، معروف ناقدین، ممتاز شعرا اور اہم اہلِ قلم شامل رہے ہیں چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد اور علامہ اقبال سے لے کر لمحۂ موجود تک ـــــ ممتاز ادبی شخصیات کی ایک کہکشاں ملتی ہے۔ یہ دعویٰ مبالغہ نہ سمجھا جائے کہ برصغیر کی تخلیقی اور تہذیبی تاریخ کے بیشتر روشن ناموں کا گورنمنٹ کالج لاہور سے کسی نہ کسی طرح تعلق رہا ہے، وہ اگر استاد نہ تھے تو طالبعلم تھے۔ میں جب دلی میں تھا تو ایک استقبالیہ میں میرا تعارف کراتے ہوئے ظفر پیامی (دیوان بریندر ناتھ) نے بڑی خوبصورت بات کی کہ برصغیر میں صرف دو طبقات ملتے ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق گورنمنٹ کالج لاہور سے رہا ہے اور دوسرا اس کے برعکس!

اس امر پر بطورِ خاص زور دینے کی ضرورت نہیں کہ استاد طلبہ کی شخصیت سازی میں

اساسی کردار ادا کرتا ہے اور ان کی ذہنی آبیاری کر کے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو صیقل کرتا ہے، بشرطیکہ استاد محض ''پروفیسر'' نہ ہو بلکہ مطالعہ کے ساتھ ساتھ ادب ونقد یا فنونِ لطیفہ کے کسی اور شعبہ سے تخلیقی دلچسپی بھی رکھتا ہو، بلاشبہ ایسا استاد صحیح معنوں میں ''مُعلم'' ہوتا ہے اور طلبہ کے لئے متعلقہ مضمون کے لحاظ سے علم، معلومات اور کوائف کی ایک کان ثابت ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور اس لحاظ سے برصغیر میں اپنے انداز کی واحد مثال ہے کہ (بعض صورتوں میں تو) استاد اور شاگرد دونوں ہی تخلیق اور ادب ونقد کی دنیا میں ممتاز اور منفرد ثابت ہوئے، یہی نہیں بلکہ بعض شخصیات تو تاریخ ساز بھی ثابت ہوئیں۔ فہرستِ اسما مرتب کرنے کے بجائے صرف تین نام کافی ہوں گے۔ اقبال، فیض اور راشد! کیا ان تین ناموں کے بغیر شاعری اور اس کے ساتھ ساتھ جدید روّیوں کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے؟

علامہ اقبال اور گورنمنٹ کالج لاہور کے تعلق کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جبکہ فیض اور راشد کے بارے میں اس نقطۂ نظر سے برائے نام لکھا گیا ہے۔ کسی خاکہ میں کسی واقعہ کا تذکرہ یا کسی شخصیت کا حوالہ اور بس! زمانۂ طالب علمی میں یہ دونوں کیا کچھ لکھ چکے تھے، یہ اب گورنمنٹ کالج کے مجلّہ ''راوی'' کی پرانی فائلوں میں مقفل ہے۔ اس عہد کی شاعری کا مطالعہ دو امور کی بنا پر ضروری ہے کہ ان دونوں نے زمانۂ طالب علمی کا بیشتر کلام ''نقشِ فریادی'' اور ''ماورا'' میں شامل نہ کیا، اس لئے آج اس زمانے کے کلام کی تاریخی اہمیت ہے۔ زمانۂ طالب علمی کے کلام کا مطالعہ اس امر کی تفہیم کے لئے بھی ضروری ہے کہ جب فیض اور راشد ''بن رہے'' تھے تو وہ کیا کچھ لکھ رہے تھے اور پھر جب وہ ''بن گئے'' تو ابتدائی تخلیقی مشق سے کتنا آگے نکل گئے۔ یوں آغاز واختتام میں جو تخلیقی ''بُعد'' ملتا ہے وہ ان کی تخلیقی شخصیت کی تفہیم کے لئے کارآمد معلومات مہیا کر سکتا ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھیے کہ سال سوم کا طالب علم فیض یہ شعر کہتا ہے:

مرے نالوں سے امشب پوچھتی تھی اس کی معصومی
کوئی کیوں رات کی خاموشیوں میں اٹھ کے روتا ہے

فیض راشد سے جونیر تھے۔

''راوی'' (۳۲۔ ۱۹۲۸ء) کے پرچے دیکھنے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ راشد خاصا فعال تھا اور اس کی نظموں کے علاوہ مختصر نثری تحریریں (جن میں سے بعض طنزیہ بھی تھیں) ''راوی'' میں شائع ہوتی رہیں۔ وہ ''راوی'' کا مدیر (۳۲۔ ۱۹۳۱ء) بھی رہا اور اپنے زمانۂ ادارت (۱۹۳۲ء) میں یہ جدت کی کہ ''راوی'' کا ''اولڈ بوائز نمبر'' (شمارہ: مارچ اپریل ۱۹۳۲ء) نکالا جس کا اداریہ راشد کے قلم سے تھا:

''وائے گفت برہمن را چگونہ بودہ است آں۔۔۔

اس وقت جب ہم راوی کے اولڈ بوائز نمبر کا اداریہ لکھ رہے ہیں ہم بفضلِ خدا خود بھی نصف کے قریب اولڈ بوائے ہو چکے ہیں اس لئے کہ ایم اے کے امتحان کے بعد ہم نے آج ہی ''غسلِ صحت'' کیا ہے۔۔۔''

اسی اداریہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ''راوی'' میں ''طرطوشی''، ''غواشی'' اور ''دشاری'' جیسے فرضی ناموں سے لکھی گئی طنزیہ تحریریں راشد ہی کی تھیں۔ اس نمبر کی ترتیب میں نائب مدیر نسیم حسن تھے۔ اسی اداریے کے سنہ سے راشد کا زمانۂ طالب علمی کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے یعنی اس نے ۱۹۲۶ء میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا ہوگا۔ ۱۹۲۸ء میں مطبوعہ بعض نظموں پر نام کے ساتھ ''تھرڈ ایئر'' بھی درج ہے۔ راشد نے اکنامکس میں ایم اے کیا تھا۔ اس زمانہ کے ''راوی'' سے یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ فیض کے مقابلہ میں راشد زیادہ پرگو تھا گویا فیض ہمیشہ ہی کم گو رہا!

نومبر ۱۹۲۸ء کے ''راوی'' میں راشد کی نظم 'التجائے سکون' کو مدیر کے اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا گیا:

''راشد وحیدی صاحب نے مندرجہ ذیل نظم ''بزم سخن'' کے انعامی مشاعرہ منعقدہ ۷ نومبر ۱۹۲۸ء میں پڑھی۔ یہ نظم مشاعرہ کی بہترین نظم تسلیم کی گئی اور راشد صاحب کو بزم کی طرف سے ایک روپہلی تمغہ عطا کیا گیا۔ مبارک۔ ایڈیٹر''

''راوی'' شمارہ مئی ۱۹۲۸ء میں ایڈیٹر محمد منصور بی اے نے اداریہ میں جن قلمی معاونین کا خصوصی شکریہ ادا کیا ان میں ''راشد وحیدی'' بھی شامل ہے۔

''راوی'' میں راشد نے جو نثر لکھی اس کا غالب رنگ طنزیہ ہے چنانچہ دسمبر ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں مدیر محمد منصور بی اے کے تعریفی نوٹ کے ساتھ 'رسوائے عام جنتری' کے عنوان سے دلچسپ پیروڈی شائع ہوئی ہے جبکہ اپریل ۱۹۲۹ء کے شمارہ میں 'گنجینۂ حکمت' کے عنوان سے ایک اور پیروڈی ملتی ہے۔ 'ہمارا نائی' طنزیہ مضمون از ''نذر محمد راشد فورتھ ایئر'' (''راوی'' اکتوبر ۱۹۲۹ء) میں طبع ہوا۔ فروری ۱۹۳۲ میں 'اردوئے مجلّی' غالب کی پیروڈی ہے اور نام کی جگہ ''ن۔م۔ر'' لکھا ہے۔

اس دور کے ''راوی'' میں ناقابلِ اشاعت تحریروں کا طنزیہ اسلوب میں تذکرہ ہوتا تھا اور ہر مدیر غیر معیاری تحریروں اور شعروں پر عملِ جراحی کرنے کو مدیرانہ فرائض میں سے گردانتا تھا، بھلا راشد کیوں پیچھے رہتا۔ نومبر ۱۹۳۱ء اور جنوری ۱۹۳۲ء کے شماروں میں راشد نے ناقابلِ اشاعت مضامین کے بارے میں 'کشتی شکستگانِ نیم اے بادِ شرط برخیز' کے عنوان سے طنز کے جوہر دکھائے ہیں۔ فروری ۱۹۳۱ء میں 'رجال الغیب' بھی اسی انداز کی تحریر ہے۔ جنوری ۱۹۳۲ء کے ''راوی'' میں ایک پیروڈی بھی ملتی ہے 'انشائے ابوالفضلِ جدید'۔

''راوی'' جنوری ۱۹۳۲ء ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳ دسمبر ۱۹۳۱ء کو بخاری صاحب کی رہائش گاہ پر اردو مجلس کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں راشد نے ''اختر شیرانی کے ساتھ چند لمحے'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا جو کافی لمبا ہونے کے باوجود دلچسپی سے سنا گیا۔

مئی جون ۱۹۳۳ء کے ''راوی'' میں شیخ عبدالرحمٰن کی نظم 'دعوت' پر درج نوٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے:

''ن م راشد ایم اے، سید محمد جعفری ایم اے، ایم اوایل اور خورشید انور بی اے (آنرز) اور خاکسار (یعنی مدیر: عمر فاروق) کی ادارت میں ایک پرچہ کہکشاں نکلنے

والا ہے۔ یہ نوجوانوں کا رسالہ ہوگا اور اس کی امتیازی خصوصیات دنیا کے مشہور ترین مصوری کے شاہکاروں پر تنقید، شبابہ نظمیں، طبع زاد افسانے اور بے باک تنقیدیں ہوں گی۔"

آج اس امر کا تعین مشکل ہے کہ "کہکشاں" نکلا یا نہیں لیکن ان ناموں کا ملاپ قابلِ توجہ ہے اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو خورشید انور ہمارے نامور موسیقار خواجہ خورشید انور ہیں اور کیا سید محمد جعفری وہی معروف مزاحیہ شاعر ہیں؟

راشد نے "راوی" کے جتنے پرچے مرتب کیے، ان کے اداریے بھی قلم بند کیے جو زیادہ تر مختصر یعنی ڈیڑھ صفحہ کے ہوتے تھے لیکن یہ محض روایتی اداریے ہونے کے برعکس جدت پسندی کے مظہر تھے۔ مثلاً اکتوبر ۱۹۳۱ء کے اداریہ میں راشد نے "عزیز دوست شیخ محمد اکرام صاحب کا جہاز پر سے پہلا مکتوب" شامل کیا ہے جبکہ فروری ۱۹۳۲ء کے اداریہ میں یہ لکھا ہے:

"راوی کے اس نمبر سے مسٹر نسیم حسن میرے شریکِ کار ہیں چنانچہ یہ اشاعت انھوں نے میری "نگرانی" میں ترتیب دی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ان دنوں جب میں "امتحانی مصروفیات" کے مرض میں مبتلا ہوں گا تو وہی راوی کے مضمون نگاروں پر عملِ جراحی کریں گے۔ آج کے بعد اگر آپ کے ساتھ کسی قسم کا "غیر شریفانہ" برتاؤ ہو تو:

کہیے نسیمِ صبح سے مجھ سے نہ پوچھیے
لڑیئے ہوا سے کیوں مرے گیسو بکھر گئے

اور بس (ن۔م۔ر)"

جہاں تک مجلہ "راوی" کا تعلق ہے تو "قدیم" "راوی" "آج" کے راوی سے خاصہ مختصر اور مختلف بھی تھا۔ ایک تو ضخامت کے اعتبار سے یعنی بمشکل پندرہ بیس صفحات، لیکن پرچے سال میں کئی نکلتے تھے۔ اردو کے ساتھ انگریزی، پنجابی اور ہندی ایڈیشن بھی چھپتے تھے۔ البتہ آج کے

برعکس اس وقت پرچہ صرف طلبہ کی تحریروں کے لئے وقف تھا۔ اساتذہ کم اور باہر کے اہل قلم عنقا، جبکہ آج برعکس ہے یعنی باہر کے معروف اہل قلم اور اساتذہ کی تحریروں کے مقابلہ میں طلبہ کی تحریریں خاصی کم ہوتی ہیں۔ کالج کے مجلات میں سے یہ اعزاز صرف "راوی" کو حاصل ہے کہ بڑے سے بڑا ادیب بھی اس میں چھپنے کو اعزاز جانتا ہے۔

(۲)

نذر محمد راشد نے ن م راشد بننے تک کئی مراحل طے کیے۔ "راوی" کے پرچے دیکھنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے نام سے خوش نہ تھا۔ نام کی ناپسندیدگی یوں ہی بلاوجہ نہیں ہوتی۔ سیدھی سی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ بعض اوقات نام فیشن ایبل نہیں ہوتا اور اس سے قدامت اور یبوست کی بُو آتی ہے، لہٰذا اس سے پیچھا چھڑانے کی سعی کی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض اوقات نام کی ناپسندیدگی لاشعوری ہوتی ہے اور یوں اس سے گہری نفسیاتی معنویت بھی وابستہ ہوتی ہے۔ نام والدین رکھتے ہیں اس لئے اس سے اظہارِ بیزاری کا بیشتر صورتوں میں والدین جبکہ ان میں سے بھی کسی ایک کو مسترد کر دینے سے تعلق ہوتا ہے، وہ شعراء جو صرف اپنے تخلص ہی سے پہچانے گئے جیسے جوشؔ، وہ بھی اسی نفسیاتی الجھاؤ کا شکار تھے ("یادوں کی برات" تو ایڈی پس کمپلیکس کا رزمیہ ہے) اس طرح اصل کے بجائے قلمی نام اپنا کر گویا نام ہی نہیں بلکہ اس نام سے وابستہ تمام ماضی سے بھی قطع تعلق کر لیا جاتا ہے۔ ثناء اللہ نے میرا جی بن کر اپنی لیجنڈ کی تشکیل کی۔ اسی طرح جب نام کے برعکس صرف تخلص اپنایا جاتا ہے تو اس مقصد کے لئے منتخب کردہ لفظ (ناسخ، آتش، غالب، حالی) بھی ایک طرح سے نفسی اشاریہ بن کر شخصیت کے بعض گوشوں کی طرف راہنمائی کا باعث بن سکتا ہے۔

اس نفسیاتی پس منظر کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ مشرق اور مغرب میں نام سے جداگانہ روایات وابستہ ہیں۔ مشرق میں ولدیت، کنیت، القابات، خطابات اور احترامات کے

اضافے سے نام میں طوالت پیدا کرنے کا رجحان غالب رہا ہے اور یقیناً یہ درباداری کے زیرِ اثر اور خود کو عوام سے مُمیّز و ممتاز رکھنے کا ایک انداز تھا اسی لئے غالب جب منشی شیونرائن کو بطور خاص اس امر کی تاکید کرتا ہے تو یہ باعث تعجب نہیں محسوس ہوتا:

''نواب اسداللہ خاں لکھو یا مرزا اسداللہ خاں ـــــ بہادر کا لفظ دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔''

الغرض! ہمارے ہاں نام کو مختصر کرنے کا چلن نہ تھا۔ یہ انگریزی اثرات تھے جو بعض حضرات نے نام کو محض حروف میں تبدیل کر دیا ـــــ تو یہ ہے وہ تناظر جس میں یہ دیکھنا ہے کہ نذر محمد ن۔م بننے پر مُصر تھا مگر وہ آسانی سے ن م راشد نہ بن سکا۔ کبھی وہ نذر محمد راشد ہے تو کبھی راشد وحیدی حتیٰ کہ ''علی پور کا ایلی'' بننے کے مصداق وہ راشد علی پوری بھی لکھتا رہا۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے نام نے کیسے کمپلیکس کی صورت اختیار کر لی تھی۔ شاید اس نے اپنے ذہن میں اپنی جو تصویر مرتب کر رکھی تھی وہ ''نذر محمد'' کے چوکھٹے میں نہیں سجتی تھی۔ تھرڈ ایئر (۱۹۲۸ء) سے اس نے نام کے ساتھ دست و گریبان ہونے کے جس عمل کا آغاز کیا وہ ایم اے (۱۹۳۲ء) میں تکمیل پا جاتا ہے یعنی نذر محمد ـــــ ن م راشد بننے کے مراحل طے کر لیتا ہے ـــــ اس کے نام نے جو جو کروٹیں لیں ''راوی'' سے اس کی شہادت مل جاتی ہے:

راشد وحیدی:	اکتوبر ۱۹۲۸ء
راشد علی پوری:	نومبر ۱۹۲۸ء
راشد وحیدی:	دسمبر ۱۹۲۸ء
راشد علی پوری:	جنوری ۱۹۲۹ء
نذر محمد راشد:	اکتوبر ۱۹۲۹ء
نذر محمد راشد:	نومبر ۱۹۲۹ء
راشد وحیدی:	فروری، مارچ، اپریل ۱۹۳۰ء
ن م راشد وحیدی:	اکتوبر ۱۹۳۰ء

راشد وحیدی:	اکتوبر، نومبر ۱۹۳۱ء
ن م راشد:	جنوری ۱۹۳۲ء

راشد (تاریخ ولادت: یکم اگست ۱۹۱۰ء) نے ۲۲ برس کی عمر میں ایم اے کیا اور ۳۱ برس کی عمر میں ''ماورا'' (سنہ اشاعت: ۱۹۴۱ء) شائع کی۔ اسی دوران اس نے زندگی کی تلخیوں کا مزہ چکھا اور مغرب کی جدید ادبی تحریکوں سے آگہی بھی حاصل کی۔ غلام ہندوستان میں تیسری اور چوتھی دہائیاں اقتصادی بدحالی اور ذہنی انتشار کے ساتھ غیر ملکی راج سے نفرت کے لئے خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ راشد بھی اپنے عہد کا کیکٹس تھا چنانچہ ادبی مسلمات سے بغاوت، کلاسیکی غزل کی نرم گرم فضا سے انحراف، علامہ اقبال کی پرشکوہ اسلامی اور اخلاقی شاعری سے گریز اور اختر شیرانی کی رومانویت سے فرار کے بعد اس نے اپنے لئے جو شعری آدرش اپنایا اس کی بنا پر وہ ''راوی'' کا کلام مسترد کرنے پر مجبور تھا جس کا اظہار ''ماورا'' کے دیباچہ میں کیا:

''اس مجموعے میں چند ابتدائی ''باقاعدہ'' نظمیں اور سانیٹ بھی شامل ہیں لیکن اکثر نظمیں وہی ہیں جن میں ہیئت اور فکر کے لحاظ سے قدیم راہوں سے انحراف کیا گیا ہے ـــــ اس مجموعے کی نظمیں میرے گذشتہ دس سال کے کلام کا انتخاب ہیں اور اسے تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اکثر احباب کو اپنی بعض پسندیدہ نظمیں اس مجموعہ میں نہ پا کر یقیناً مایوسی ہوگی لیکن انتخاب کرتے ہوئے کسی قدر سختی سے کام لئے بغیر چارہ نہ تھا۔''

یہ ''کسی قدر سختی'' کس قدر سختی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۳۲۔ ۱۹۲۸ء کے ''راوی'' میں راشد کی جو نظمیں یا سانیٹ طبع ہوئے ان میں سے محض 'ستارے' صرف دو لفظوں کی تبدیلی سے ''ماورا'' میں شامل کی گئی ہے، باقی تمام کلام متروک قرار پایا۔

'ستارے' (سانیٹ) جب ''راوی'' (اکتوبر: ۱۹۳۱ء) میں طبع ہوئی تو آخری بند کے آخری شعر کا پہلا مصرع موجودہ صورت یعنی:

کبھی یہ خاکداں فردوسِ تنویر و لطافت ہو

کے برعکس یوں تھا:

کبھی یہ خاکداں گہوارۂ حسن و لطافت ہو

''راوی'' میں مطبوعہ 'شاعر اپنی پہلی نظم دیکھ کر' ـــــ ''ماورا'' میں 'شاعر کا ماضی' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس ایک نظم کے علاوہ راشد نے باقی کچھ بھی نہ شامل کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ''ماورا'' درحقیقت ۱۹۳۲ء کے بعد کی شاعری کا انتخاب ہے۔

''راوی'' میں مطبوعہ کلام سے صرفِ نظر کی وجہ سمجھنی دشوار نہیں کہ یہ زمانہ طالب علمی میں نومشقی کی یادگار ہے اور پھر ان نظموں پر اختر شیرانی (التجائے سکون) اور ورڈزورتھ اور اقبال کی 'ہمالہ' (صبح ـــــ راوی کے کنارے) کے اثرات نمایاں تر ہیں۔ کچھ نظمیں ('محسوسات'، 'مجھے کسی سے پیار ہے') واضح طور پر ٹین ایجرز کے کچے جذبات اور کلاس فیلو لڑکیوں کو دیکھ کر خون میں ہونے والی گدگدی کی غمازی کرتی ہیں۔ الغرض یہ نظمیں صحیح معنوں میں ایک ذہین اور حساس طالب علم کی جذباتی روداد ہیں لہٰذا 'ہونٹوں کا لمس'، 'اتفاقات'، 'دریچے کے قریب'، 'بے کراں رات کے سناٹے میں' اور 'انتقام' جیسی نظمیں لکھنے والا راشد بھلا اس انداز کے شعر ''ماورا'' میں کیسے شامل کر سکتا تھا:

بے حجاب ایک کائنات ہوئی

تیرے چہرے سے کیا نقاب اٹھا!

آج ان نظموں کے تنقیدی تجزیے کی ضرورت نہیں تاہم ان کے مطالعہ سے دو امور بطور خاص نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک تو راشد کی ہیئت سے دلچسپی یعنی وہ نظم کو محض بیانیہ بنانے کے بجائے ہیئت سے زیادہ پرلطف اور جدید بنانے کی سعی کرتا ہے۔ اس کا اندازہ تھرڈ ایئر کی نظم 'التجائے سکون' سے ہی ہو جاتا ہے۔ اس لئے راشد کی سانیٹ سے دلچسپی کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ وہ تو تھرڈ ایئر میں 'اے محبت' پہلا سانیٹ قلم بند کرتا ہے۔ یہ عمر اور ذہنی استعداد کا وہ دور ہوتا ہے جس میں بیشتر طلبہ سانیٹ سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے تو بلاشبہ وہ خاصے مفرّس اسلوب میں شاعری کر رہا تھا جس میں فارسی تراکیب کششِ مزید کا باعث بنتی ہیں اور ایسا علامہ اقبال کے اسلوب سے متاثر ہوئے بغیر نہ ہو سکتا تھا۔ طالب علم راشد میں یہ عجب تضاد ملتا ہے کہ موضوعات اور فضا کے لحاظ سے تو وہ اختر شیرانی کی جذباتیت کا حامل نظر آتا ہے مگر مفرّس اسلوب میں اقبال کا مقلد ـــــ اگرچہ ''ماورا'' کی نظمیں ان دونوں رجحانات کے برعکس ہیں مگر ''راوی'' کا کلام اس امر کے تعین میں یقیناً ممد ثابت ہو سکتا ہے کہ راشد، اقبال اور اختر شیرانی جیسی دو قوی مقناطیسوں سے کیسے بچ نکلا؟

(۳)

تفصیلی تنقیدی مطالعہ کے بغیر ''راوی'' میں ملنے والی تمام منظومات زمانی ترتیب سے پیش ہیں تاکہ طالب علم راشد کی سوچ اور اسلوب میں تغیر (یا ارتقاء) کا اندازہ لگایا جا سکے۔

التجائے سکون

ردائے خواب میں خاموش سوتی ہے دنیا
مئے سکوت میں مدہوش ہوتی ہے دنیا
مثال رندِ سیہ نوش سوتی ہے دنیا

میں تیری یاد میں رہتا ہوں رات بھر بیدار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لیے

فضا میں پھیل سی جاتی ہیں چاندنی راتیں
سرودِ عیش مناتی ہیں چاندنی راتیں
سرودِ کیف بہاتی ہیں چاندنی راتیں

مگر خوشی کو ترستی ہے میری جانِ نزار

تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لیے

سحر کے وقت تو ہوتا ہے رحمتوں کا نزول
جہان والوں کی محفل پہ عشرتوں کا نزول
فضا سے لطف و مسرت کی نکہتوں کا نزول

مگر میں رہتا ہوں نا آشنائے صبر و قرار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لیے

ہزار کیف بداماں ہو لالہ زارِ شفق
نظر فروز ہو دامانِ زرنگارِ شفق
مری نظر میں سماتی نہیں بہارِ شفق

ہے میرے واسطے فطرت بھی تیرگی بکنار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لیے

ستارے شام کے جس دم کہ جھلملاتے ہیں
فلک پہ اپنی ضیاؤں کی مے لٹاتے ہیں
تو میرے دیدۂ تر اشکِ غم بہاتے ہیں

اور ان کی نذر میں کرتا ہوں موتیوں کے ہار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لیے

ترے بغیر تماشائے گلستاں بے کیف
ترے بغیر ہر اک حسن گلفشاں بے کیف
ترے بغیر ہے رنگینیِ جہاں بے کیف

ترے بغیر ہیں بے کیف میرے لیل و نہار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لیے

رہینِ آتشِ حرکت دل و جگر کب تک؟
رہے گی دور مری جہتِ نظر کب تک؟
غمِ فراق سہوں تو سہی مگر کب تک؟

نہ ہو گی جانِ حزیں آشنائے صبر و قرار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لیے

ترے شباب میں رنگینیِ بہار رہے
فروغِ حسن سے تو سحر در کنار رہے
تو خلد زارِ محبت میں جلوہ بار رہے

تو میری روح پہ کر آ کے بارشِ انوار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لیے

سپہر عشق کا ٹوٹا ہوا ستارا ہوں
تمہارے وعدۂ صبر آزما کا مارا ہوں
مگر قسم ہے تمہاری کہ میں تمہارا ہوں

ہے میری خاک میں جب تک کہ زندگی کا شرار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لیے

(راشد علی پوری تھرڈ ایئر ـــــ راوی نومبر ۱۹۲۸ء)

محسوسات

ہر ایک شے پہ فروغِ شباب پاتا ہوں
کسی کے حسن کو پھر بے نقاب پاتا ہوں
کچھ اس طرح سے پلائی ہے آج ساقی نے

کہ کائنات کو غرقِ شراب پاتا ہوں
فضائے دہر کا ہر ذرہ آج رقصاں ہے
کسی کو نغمہ طرازِ رباب پاتا ہوں
پھر آج عقل و محبت ہیں برسرِ پیکار
پھر اپنے دل کو رہینِ عذاب پاتا ہوں
جدائی ہے کہ یہ تمہیدِ ظلم رانی ہے
ابھی سے تجھ کو اسیرِ حجاب پاتا ہوں
مجھے ہے دشتِ محبت میں جستجوئے وفا
قدم قدم پہ ہزاروں سراب پاتا ہوں
پلا دے آج مجھے چشمِ کیف آگیں سے
تری نگاہوں میں رقصِ شراب پاتا ہوں
خدا کے واسطے آ بھی ارے بہانہ طراز
کہ نقشِ زیست کو نقشِ سراب پاتا ہوں
میں ایک ننگِ محبت ہوں پاکبازیِ عشق!
کہ خود کو غرقِ گناہِ شباب پاتا ہوں

(راشد وحیدی تھرڈ ایئر ـــــ راوی اکتوبر ۱۹۲۸ء)

صبح ـــــ راوی کے کنارے

یہ صبح کا وقت اور یہ راوی کا کنارا
وجد آفریں صد کیف بداماں ہے نظارا
فطرت نے ہے کس ذوق سے دریا کو سنوارا

بکھرا ہوا ہے چار طرف حسنِ فراواں
میدان میں سارے، راوی کے کنارے

بکھرے ہوئے موتی ہیں کسی زہرہ جبیں کے
کھوئے ہوئے منظر ہیں کسی خوابِ حسیں کے
ٹکڑے ہیں مگر کیف گہِ خلدِ بریں کے

یا رند ہیں مے خانۂ افلاک میں لرزاں
یہ ڈوبتے تارے، راوی کے کنارے

راوی کے کنارے کی یہ خاموش فضائیں
رعنائی فشاں، سحر در آغوش فضائیں
رنگینیِ فطرت سے ضیا پوش فضائیں

یہ صبحِ طرب ریز لبِ رود خراماں
یہ مست نظارے، راوی کے کنارے

فردوس کے نغمات سے لبریز ہے دریا
یا خلد کے نشوں سے جنوں خیز ہے دریا
یا رقص سے حوروں کے طرب ریز ہے دریا

حوریں جو ہیں آغوش میں راوی کے خراماں
دلکش ہیں نظارے، راوی کے کنارے

لیکن ہے غم آلود یہ موسیقیِ رنگیں
نغمات میں راوی کے ہے رودادِ غم آگیں
موجوں کے تبسم میں ہے اک گریۂ خونیں

اور عہدِ گزشتہ کی طرف لہروں کا ہیجان

کرتا ہے اشارے، راوی کے کنارے

رنگِ ''مئے پارینہ'' سے شاداب ہے راوی
اس ''عشرتِ برباد'' کا اک خواب ہے راوی
اُن محفلوں کی یاد میں بیتاب ہے راوی

ہاں یادِ جہانگیر میں راوی بھی ہے گریاں
لرزاں ہیں ستارے، راوی کے کنارے
(راشد علی پوری: راوی، جنوری ۱۹۲۹ء)

بازگشت

کہا تھا تم نے کبھی تم سے پیار کرتا ہوں
تمہاری یاد میں دل سوگوار کرتا ہوں
تمہارے ہجر میں نیندیں نثار کرتا ہوں

خدا کے واسطے اک بار میری ہو جاؤ

کہا کہ ''گلکدۂ حسن کی کلی ہو تم''
کہا کہ ''طورِ محبت کی روشنی ہو تم''
کہا کہ ''میرے لئے وجہِ زندگی ہو تم''

غمِ حیات میں غم خوار میری ہو جاؤ

تو سن کے تم نے کہا تھا یہ ''کیا کہا راشد
تمہیں ہے میری محبت کا اِدّعا راشد
یہ کہہ کے تم نے مجھے کر دیا خفا راشد

یہ ادّعائے محبت ہے ناگوار مجھے

سنو! سنو! کہ یہ کہنے سے مجھ کو عار نہیں
نہیں نہیں مجھے تم سے ذرا بھی پیار نہیں
غمِ جہاں میں کسی کی میں غم گسار نہیں

نہیں کسی کی محبت پہ اعتبار مجھے''

تمہاری ''کم نگہی'' سے بدل گئی دنیا
سیاہ ہو گئی میرے لئے مری دنیا
حریفِ عیش ہے کیسی یہ دکھ بھری دنیا

مری حیات کو ناشاد کر دیا تم نے

حریم حسن میں مَیں باریاب ہو نہ سکا
سکوں پذیر مرا اضطراب ہو نہ سکا
حریفِ کیفِ تمنا شباب ہو نہ سکا

مرے شباب کو برباد کر دیا تم نے

تمہارے حسن میں یوں تو بہار اب بھی ہے
ہر اک ادا میں تمہاری وقار اب بھی ہے
تمہارا روئے حسیں جلوہ بار اب بھی ہے

مگر وہ میرے لئے شعلہ باریاں نہ رہیں؟

مرے نیازِ محبت کی آبرو نہ رہی
تو دل میں سوزِ تمنا کی بھی نمو نہ رہی
مجھے تمہاری پرستش کی آرزو نہ رہی

جنونِ عشق کی وہ ہرزہ کاریاں ہی گئیں

اور اب جو میری تمنا کا اِدّعا ہے تمہیں

خیالِ خام کہاں سے یہ آ گیا ہے تمہیں
کسی نے لطفِ محبتؔ بجھا دیا ہے تمہیں

نہیں ہے دعویٰ الفت سے اب حذر تم کو؟

سنا ہے رات کو جب مجھ سے دور ہوتی ہو
تو نیند آ نہیں سکتی تمہیں نہ سوتی ہو
مرے فراق میں رو رو کے جان کھوتی ہو

مرا خیال ستاتا ہے رات بھر تم کو

اب آ کے ''حالِ دلِ زار'' تم سناتی ہو
تو گویا عشق کا اپنا یقیں دلاتی ہو
میں جانتا ہوں کہ ہاں تم مجھے بناتی ہو

نہیں رہا وہ تمہاری نگاہ میں جادو

تمہارے حسن میں وہ کیفِ دل نشیں ہی نہیں
تمہیں خدا نے دیا وہ دلِ حزیں ہی نہیں
تمہیں ہو مجھ سے محبت مجھے یقیں ہی نہیں

بہاؤ اب نہ خدارا فریب کے آنسو

(راشد: راوی۔ مئی ۱۹۲۹ء)

اے محبت

(اردو میں ایک سونیٹ)

اے محبت! دہر میں تو جنتِ گلریز ہے
ظلمت آبادِ جہاں میں منزلِ زریں ہے تو

سرزمینِ زیست پہ شہرِ طرب آگیں ہے تو
جس کے نغموں سے فضائے دہر خواب آمیز ہے
زندگی آلام کا اک کوہِ وحشت خیز ہے

اس کے دامانِ سیہ میں چشمۂ سیمیں ہے تو

اے محبت! زندگی کی وادیِ رنگیں ہے تو
آہ! جس وادی کا ہر منظر نشاط انگیز ہے
آج اس گلبار وادی سے گزرنا ہے مجھے

میرا دل اس پار جانے کے لئے بیتاب ہے

(وہ جہاں اس سرزمیں سے بیشتر شاداب ہے)
کوہساروں کے ادھر جا کر اترنا ہے مجھے
اور اس دنیا سے کوسوں دور ہے منزل مری
بس وہیں محفل وہیں ہے رونقِ محفل مری

(نذر محمد راشد: راوی۔ نومبر ۱۹۲۹ء)

اجنبیت

خدا جانے ہماری اجنبیت کیوں نہیں جاتی؟
خدا جانے ابھی تک ہم بہم نا آشنا کیوں ہیں؟
گزر رہی ہے یونہی عمر اک زمانے سے
ریاضِ دہر میں الفت کے گیت گانے سے
فسانہ ہائے نشاط و الم سنانے سے
کئی برس سے ہم اک دوسرے کے ہیں غمخوار

جو میرے دیدۂ تر اشک غم بہاتے ہیں
تو اس کی آنکھ میں بھی اشک جھلملاتے ہیں
کبھی خیالِ طرب سے جو مسکراتا ہوں
تو اس کے لب بھی تبسم میں ڈوب جاتے ہیں

کہ بزمِ مہر و محبت کے ہم ہیں بادہ گسار

مگر حیرت ہے پھر بھی اجنبیت، کیوں نہیں جاتی!

خدا جانے ابھی تک ہم بہم نا آشنا کیوں ہیں
خدا جانے ہماری اجنبیت کیوں نہیں جاتی؟
تمناؤں میں انوارِ صداقت کیوں نہیں آتی!
رہِ حیات میں مدت سے رہ سپار ہیں ہم
تلاشِ منزلِ عشرت میں بے قرار ہیں ہم
سکونِ قلب کی حسرت میں بے قرار ہیں ہم

مصافِ دہر میں مل کر ہیں برسرِ پیکار

ہم ایک ساتھ رواں ہیں طریقِ ہستی میں
گزر رہے ہیں اکٹھے عروج و پستی میں
اور ایک ساتھ ہی کرتے ہیں ہم قیام و سفر
دیارِ عیش میں دور آفتوں کی بستی میں

ہماری ایک ہی منزل ہے ایک راہگزار

مگر پھر بھی ہماری اجنبیت کیوں نہیں جاتی
خدا جانے ابھی تک ہم بہم نا آشنا کیوں ہیں

(راوی۔ جنوری ۱۹۳۰ء)

مجھے تم سے ایسی محبت نہیں ہے

مجھے تم سے یوں تو ہے پرجوش الفت
جوانی کی مستی میں مدہوش الفت
رہی ہے مگر دل میں خاموش الفت

کہ عرضِ تمنا کی حاجت نہیں ہے
مجھے تم سے ایسی محبت نہیں ہے

تمہاری تمنا میں بے تاب ہوں میں
جوانی کی راتوں میں بے خواب ہوں میں
غمِ ہجر میں رشکِ سیماب ہوں میں

مگر تم سے کوئی شکایت نہیں ہے
مجھے تم سے ایسی محبت نہیں ہے

میں اظہارِ ذوقِ تمنا کروں گا
تمہاری محبت کا دعویٰ کروں گا
سمجھتی ہو میں تم کو رسوا کروں گا

خدا جانتا ہے یہ عادت نہیں ہے
مجھے تم سے ایسی محبت نہیں ہے

جو چاہوں تو یہ راز مذکور کر دوں
تمہاری جفاؤں کو مشہور کر دوں

تمہیں پھر محبت پہ مجبور کر دوں
مگر دل نہیں ہے، طبیعت نہیں ہے
مجھے تم سے ایسی محبت نہیں ہے

(راشد وحیدی: راوی۔فروری ۱۹۳۰ء)

زندگی (سانیٹ)

ہماری زندگی بھی کس قدر ویران منزل ہے
شبِ تاریک ہے، رستے سے نا آشنا بھی ہیں
مسافت دور کی ہے شکوہ سنجِ ''رہنما'' بھی ہیں
بیاباں ہے، بلا کی تیرگی، سنسان منزل ہے
خدا جانے ہمارے اس سفر کا مدعا کیا ہے؟
''وطن'' اپنے وطن سے دور اپنی سرزمیں میں ہم
اڑے جاتے ہیں اس تاریکیِ ہول آفریں میں ہم
ہماری آرزو کیا ہے ہمارا منتہا کیا ہے
یہ تاریکی، یہ سناٹا، یہ دہشت خیز ویرانی
کمالِ خستگی سے پاؤں کی طاقت رہی جائے
رہا جائے الٰہی حوصلہ بھی دم بدم اپنا
اگر ہے اس قدر سامانِ لغزش کی فراوانی
تو اس حالت میں ہم سے کس طرح امید کی جائے
رہے ''اک جادۂ موہوم'' پر ثابت قدم اپنا

(راشد وحیدی: راوی۔مارچ ۱۹۳۰ء)

جوانی (سانیٹ)

جدائی ہے میرے دل کو تمنائے محبت ہے
ریاضِ حسن کے اک پھول کی ہے آرزو مجھ کو
جہاں میں اک شعاعِ نور کی ہے جستجو مجھ کو
مہیب وغم فزا تاریکیوں سے مجھ کو نفرت ہے
جوانی ہے بہاریں ہیں فضا لبریزِ نکہت ہے
نشاط افزا نہیں فطرت کا طوفانِ نمو مجھ کو
جنوں انگیز ہے یہ خلد زارِ رنگ و بو مجھ کو
سیہ تنہائیوں میں میرا دل محرومِ عشرت ہے
بہاریں مجھ کو پیغامِ طرب آ کر سناتی ہیں
ہوائیں چھیڑتی ہیں میرے حسیات کو آ کر
مرے دل میں ہزاروں محشرِ جذبات سوتے ہیں
مرے دل کو جوانی کی امیدیں گدگداتی ہیں
جگانا چاہتی ہیں وہ مرے جذبات کو آ کر
مگر یہ ''نیند کے ماتے'' نہیں بیدار ہوتے

(راشد وحیدی: راوی۔اپریل ۱۹۳۰ء)

مجھے کسی سے پیار ہے

دیارِ حسن میں اک ''ساحرہ سی'' رہتی ہے
حریمِ ناز میں اک ''کافرہ سی'' رہتی ہے
ریاضِ شعر میں اک ''شاعرہ سی'' رہتی ہے
اسی سے پیار مجھے ہے، اسی سے پیار مجھے

وہ ساحرہ کہ طلسمِ حیات اسی سے ہے
وہ کافرہ کہ جہاں کو ثبات اسی سے ہے
وہ شاعرہ کہ مری کائنات اسی سے ہے
اسی سے پیار مجھے ہے، اسی سے پیار مجھے

طواف خانۂ حرمت میں ہے قیام اس کا
بہشتِ عفت وعصمت میں ہے خرام اس کا
نجوم و ماہ سے بڑھ کر ہے احتشام اس کا
اسی سے پیار مجھے ہے، اسی سے پیار مجھے

(ن م راشد وحیدی: راوی۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء)

''عمرت دراز باد فراموش گار من''

تمہیں وہ چاندنی راتوں کے پیار بھول گئے؟
فروغِ عشق کے لیل و نہار بھول گئے؟
وہ جھیل بھول گئی سبزہ زار بھول گئے؟
ہمارے عشق کے وہ رازدار بھول گئے؟

جہاں پہ تم نے کیے تھے نباہ کے دعوے
وہ شام ہائے درخشاں بھی تم کو یاد نہیں؟
وہ سیلِ حسنِ فراواں بھی تم کو یاد نہیں؟
وہ اپنی آمدِ پنہاں بھی تم کو یاد نہیں؟
وفا کے وعدہ و پیماں بھی تم کو یاد نہیں؟
کہاں گئے ہیں وہ شبہائے ماہ کے وعدے

(راشد: راوی۔ فروری ۱۹۳۱ء)

شاعر اپنی پہلی نظم دیکھ کر

یہ شب ہائے گزشتہ کے جنوں زائیدہ افسانے
یہ آوارہ پریشاں زمزمے سازِ جوانی کے
یہ میری عشرتِ برباد کی بے باک تصویریں
یہ آئینے مرے شوریدہ آغازِ جوانی کے

یہ اک رنگیں غزل لیلیٰ کی زلفوں کی ستائش میں
یہ تعریفیں سلیمی کی فسوں پرور نگاہوں کی
یہ جذبے سے ہوا اظہار شیریں کی محبت کا
یہ اک گزری کہانی آنسوؤں کی اور آہوں کی

کہاں ہو آہ او لیلیٰ کہاں ہو آہ او شیریں؟
سلیمی تم بھی تھک کر رہ گئیں راہِ محبت میں؟
مرے عہدِ گزشتہ پر سکوتِ مرگ طاری ہے

مری شمعو! بجھی جاتی ہو کس طوفانِ ظلمت میں

مرے شعرو! مرے فردوسِ گم گشتہ کے نظارو
ابھی تک ہے دیارِ روح میں اک روشنی تم سے
کہ میں حسن و محبت پر لٹانے کے لئے تم کو
اڑا لایا تھا جا کر محفلِ مہتاب و انجم سے
(راشد: راوی۔ فروری ۱۹۳۲ء)

''راوی'' کے اولڈ بوائز نمبر ـــــ (مارچ، اپریل ۱۹۳۲ء) میں راشد کے نام سے یہ شعر بلاعنوان درج ہیں:

تیرے شوقِ فزوں انگیز سے ہے زندگی مجھ میں
اسی سے دل کی گہرائی میں قندیلیں درخشاں ہیں
اسی سے رنج و غم کی ظلمتیں مجھ سے گریزاں ہیں
اسی سے آج تک باقی ہے رنگِ شاعری مجھ میں
اور اس سے آج تک رہنے کے قابل ہے زمیں گویا
اسی سے یہ زمیں ہے رشکِ فردوسِ بریں گویا

اسی نمبر کے ایک مضمون کے اختتام پر (ص: ۱۷) خالی جگہ پر راشد کے نام سے یہ شعر درج ہے:

اٹھی ہے پھول پھول سے اک موجِ انبساط
اک قلزمِ جنوں ہے گلستاں بہار میں ـــــ!

صفحہ ۳۲ پر یہ شعر درج ہے:

بے حجاب ایک کائنات ہوئی
تیرے چہرے سے کیا نقاب اٹھا

صفحہ ۲۳ پر راشد نے ۴ اشعار بلاعنوان درج کیے ہیں:

دنیا ہے تیرا نقشِ کفِ پا مرے لیے
رشکِ ہزار خلد ہے دنیا مرے لیے
دل میں تری نظر کی خلش عمر بھر رہے
بس یہ ہے انتہائے تمنا مرے لیے
مجھ کو ملی ہے شہرتِ جاوید آپ سے
ہونا پڑا ہے آپ کو رسوا مرے لیے
وہ جانِ آرزو تو کسی اور کی نہیں
کیا غم ہے گر نہیں ہے یہ دنیا مرے لیے

اور صفحہ ۴۷ پر یہ تین مصرعے درج ہیں:

مجھے محبت نے ذوقِ تقدیس مثلِ رنگِ سحر دیا ہے
جہان بھر کی لطافتوں سے مری جوانی کو بھر دیا ہے
مرے گلستاں کو آشنائے بہارِ جاوید کر دیا ہے